معاشرہ میں منبر و محراب کا کردار۔ایک تحقیقی جائزہ

Roles of Miner and Alter in a society. A research-based analysis

ڈاکٹر محمد اسحاق*

ڈاکٹر عزیزالرحمن سیفی

ABSTRACT:

Masjid is a holy place of ALLAH, which is not only a central point for prayers but also a pivotal point for Muslim Collectivism. Miner and Altar (Menbar o mehrab) are the most important place in a Masjid from where people have been acquiring religious, political and social guidance for centuries. In the era of Prophet Muhammad and during Caliphate, the services of a Masjid used to be very wide-ranging and comprehensive. The sermon of reigning Caliph was delivered on this very Miner of Masjid. From here, the general public was given the awareness of new policies and State decisions. But, the scope of the services of Masjid got very narrowed down when those who were responsible for the state abandoned their role of leading from this platform. now the role of Miner & Altar is limited to providing only the religious guidance. Even then, in recent times, the state of Masjid in our society has been deter-iorated. From the Miner and Altar of a Masjid, we listen more of sectarianism rather than the Deen-e-Islam itself. The same old conventional and controversial matters are repeated again and again; and the contemporary religious issues are put aside and ignored. There is a proper code of conduct in many countries in this regard. But, we have a very different situation in our country where the Miner and Altar are very much autonomous and independent. So, the custodianship of Miner and Altar in Masjid should only be given to well-educated and reasonable people who have good eye for contemporary environment and guide their followers by discussing important social and religious issues rather than propagating their preferred sects. And more importantly, the representative of the government should also periodically take charge of this custodianship so that the masses are politically guided and they become closer to each other as well.

Keywords: Masjid, Miner and Altar (Menbar o mehrab), Muslim Collectivism.

مسجد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی اور اجتماعیت کا مرکز ہے۔ دنیا بھر کی مساجد بیت اللہ کی روحانی شاخیں ہیں جہاں ہر لمحہ خالق کائنات کی طرف سے رحمتیں برستی ہیں۔ یہ اطمینان اور سکون کی جگہیں ہیں۔ ہر مذہب میں ان کے اعتقاد کے مطابق ایسی جگہیں اور عبادت گاہیں بنائی جاتی ہیں جہاں اس مذہب کو ماننے والے حصولِ تسکین کیلئے حاضری دیتے ہیں، ہمارے لئے ایسی جگہ مسجد کو بنا دیا گیا اور اس کا روحانی تعلق کعبۃ اللہ سے جوڑ دیا گیا کہ وہ اہل ایمان کا قبلہ ٹھہرا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس اولِ بیت کی اول تعمیر اول انسان سیدنا

*Assistant Professor, Department of Usool-ud-Din, University of Karachi, Karachi.
Email: ishaqalam@uok.edu.pk
Assistant Professor, Department of Arbic, University of Karachi, Karachi.

آدم علیہ السلام کے ہاتھوں کرائی گئی۔ اور پھر اس کیلئے بالکل وسط ارض کا انتخاب ہوا تاکہ کسی بھی خطے میں رہنے والوں کیلئے اس مقام تک پہنچنا دشوار نہ ہو اور یہاں بندگانِ خدا کا اجتماع سہولت کے ساتھ ہوسکے۔ نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی دیکھیں تو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرماکر آپ سب سے پہلے مسجدِ قباء کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور پھر چند ہی روز بعد مسجدِ نبوی کا سنگ بنیاد رکھنے کیلئے سبیل بنارہے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد صرف نماز پڑھنے کا ہی مرکز نہیں بلکہ یہ ایک معاشرتی ادارہ بھی ہے۔ مسجدِ نبوی کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے رسول اللہ ﷺ صرف دینی نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی رہنمائی بھی فرمایا کرتے تھے۔ لوگوں کے درمیان فیصلے ہوتے تھے، وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، مختلف اہم امور میں مشاورت کیلئے صحابہ کرام کو یہاں جمع ہونے کا حکم ہوتا تھا، گویا مسجدِ نبوی اس دور کا پارلیمنٹ بھی تھی۔ علاوہ ازیں مسجدِ نبوی سے جیل کا کام بھی لیا جاتا تھا، جیسا کہ قبیلہ بنو حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو قید کرنے کے سلسلے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: انہ ﷺ مر علی ثمامة ثلاث مرات و هو مربوط فی المسجد و انما امر باطلاقه فی الیوم الثالث[1]۔ نبی کریم ثمامہ پر سے تین بار گزرے اور وہ مسجد میں بندھے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے تیسرے روز ان کو آزاد کرنے کا حکم فرمایا۔

آپ ﷺ ریاست کا پورا نظم یہیں سے چلایا کرتے تھے، یہاں تک کے دور دراز سے آنے والے وفود سے ملاقاتیں بھی مسجد ہی میں فرماتے تھے، ان میں ایک واقعہ وفد ثقیف کا ہے جو اس حوالے سے ممتاز ہے کہ ان کے لئے مسجدِ نبوی میں باقاعدہ خیمہ لگایا گیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں: "عبدیالیل طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو (حالانکہ اب تک وہ کافر تھا) مسجدِ نبوی میں اتارا (کہ مسلمانوں کی محویت اور استغراق کو دیکھ کر متاثر ہو) یہ لوگ صحنِ مسجد میں خیمہ نصب کراکر ٹھہرائے گئے۔ نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے، گو خود شریک نہیں ہوتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ خطبہ میں اپنا نام نہیں لیتے تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد ﷺ ہم سے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو ارشاد فرمایا کہ "میں سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ میں فرستادہ الٰہی ہوں۔"[2]

دورِ رسالت میں مسجدِ نبوی کی حیثیت واقعی بہت ممتاز تھی۔ اسی طرح کے ایک خیمہ کا ذکر حضرت سعد بن معاذ کیلئے بھی ملتا ہے۔ یہ غزوہ خندق میں زخمی ہوگئے تھے تو ان کی تیمارداری کیلئے مسجدِ نبوی میں خیمہ نصب کیا گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرماتی ہیں: اصیب سعد یوم الخندق فی الاکحل، فضرب النبی ﷺ خیمة فی المسجد لیعوده من قریب[3]۔ حضرت سعد کو غزوہ خندق کے موقع پر بازو میں زخم لگا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے مسجد میں خیمہ لگایا تاکہ قریب سے ان کی تیمارداری کرسکیں۔

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مسجد محض ادائے نماز ہی کے لئے نہ تھی بلکہ یہ ایک یونیورسٹی تھی جس میں مسلمان اسلامی تعلیمات و ہدایات حاصل کرتے تھے اور ایک محفل تھی جس میں مدتوں جاہلی کشاکش و نفرت اور باہمی لڑائیوں سے دوچار رہنے والے قبائل کے افراد اب میل محبت سے مل جل رہے تھے۔ نیز یہ ایک مرکز تھا جہاں سے اس ننھی سی ریاست کا سارا نظام چلایا جاتا تھا اور مختلف قسم کی مہمیں بھیجی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس کی حیثیت ایک پارلیمنٹ کی بھی تھی جس میں مجلس شوریٰ اور مجلس انتظامیہ کے اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ یہ مسجد ہی

ان فقراء مہاجرین ایک خاص بڑی تعداد کا مسکن تھی جس کا وہاں پر نہ کوئی مکان تھا نہ مال اور نہ اہل و عیال۔"[4]

پھر بعد میں خلافت راشدہ کے ادوار میں اسلام کو مزید ترقی ملی، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور خلافت کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں تو پھر بہت سے امور کیلئے مسجد سے باہر عمارتیں بنادی گئیں، بیت المال بنا، فوجی چھاؤنیاں بنیں، جیلیں بنیں لیکن اجتماعیت کا مرکز مسجد ہی کو رکھا گیا۔ اسی وجہ سے خلیفہ وقت کا خطاب مسجد میں ہی ہوا کرتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مختلف قبائل کو اپنے محلوں میں اپنی مسجد بنانے کا حکم فرماتے تا کہ اس قبیلہ کے مسلمانوں کا اتحاد برقرار رہے اور ان کی اجتماعیت کو ٹھیس نہ پہنچے۔

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ اس حوالے سے لکھتے ہیں: "چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تسبیح و تقدیس الٰہی تھا اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں بلکہ درحقیقت یہ تمام اہل قریہ یا اہل محلہ کو دن رات پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے ان کی اجتماعی اور اتحادی قوت کو روز بروز اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بھی بنتی تھیں۔"[5]

رسول اللہ ﷺ نے اس وقت ہر اعتبار سے مسلمان کو مسجد سے جوڑے رکھا اور ان کو یہ باور کرایا کہ اس گھر سے ربط نہ رکھنے کی صورت میں اپنا اتحاد کھودوگے، اور یہ کہ یہ مسجد صرف نماز ادا کرنے کی جگہ نہیں بلکہ یہ اسلام کا ایک مضبوط ریاستی ادارہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسجد کو شعائر اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی مسجد معاشرتی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کی علامت بھی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: أنه من شعائر الاسلام وهو قوله صلى الله عليه وسلم ''اذا رأيتم مسجدا أو سمعتم مؤذنا فلاتقتلوا احدا'' و انه محل الصلاة معتكف العابدين و مطرح الرحمة و يشبه الكعبة من وجه۔[6]

ترجمہ: بلاشبہ مسجد شعائرِ اسلام میں سے ہے اور اس کی بنیاد نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے "جب تم کوئی مسجد دیکھ لو یا اذان سن لو تو پھر کسی کو قتل مت کرو" اور یہ کہ مسجد نماز کی جگہ اور عبادت کرنے والوں کا مرکز ہے جہاں اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور اسی وجہ سے مسجد ایک طرح سے کعبہ کے مشابہ ہو جاتی ہے۔

ان تمام باتوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلم معاشرہ میں مسجد کی غیر معمولی حیثیت ہے۔ منبر و محراب مسجد ہی کا ایک خاص اور نہایت ہی حساس مقام ہے جس کی طرف تشنگانِ دین کی ہر وقت توجہ رہتی ہے۔ یہاں سے لوگوں کی مذہبی، سیاسی اور سماجی رہنمائی ہوتی ہے۔ اس جانب سے سب کے کانوں میں ایک جیسی آواز پہنچتی ہے۔ اس جانب سے اٹھنے والی صدا مثبت ہو تو اس کا معاشرہ پر اثر بھی اچھا پڑتا ہے، فساد کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ ورنہ اس جانب سے اٹھنے والی منفی آواز معاشرہ کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ لوگوں کے اندر سے اتحاد کی دولت چھین کر اختلاف کی راہ ہموار کرتی ہے، اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے۔ دورِ حاضر میں منبر و محراب کا کیا کردار ہے، ہم اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں اس مقام کا کردار دیکھیں اور آج کے دور کا اس سے تقابل کریں تو بہت سی خامیاں اور کمزوریاں واضح نظر آتی ہیں۔

منبر و محراب کا کردار قرونِ اولیٰ میں:

اس سلسلے دور رسالت اور دور خلافت راشدہ ہمارے لئے آئیڈیل ادوار ہیں۔ ان عظیم ہستیوں نے منبر سے مذہبی، سیاسی، سماجی اور

معاشرتی و معاشی ہر طرح کی بات کی ہے۔ اس وقت منبر سے سیاسی موضوعات پر کھل کر بات ہوتی تھی۔ یہاں سے تجارت وزراعت کے حوالے سے بھی گفتگو سنائی دیتی تھی۔ اجتماعی امور سے متعلق تمام امور مسجد کے منبر سے ہی طے ہوتے تھے۔ لوگوں کے درمیان فیصلے بھی یہیں سے ہوتے گویا مسجد کا منبر دینی اور معاشرتی اصلاحات کیلئے مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں سے ملنے والی ہدایات کو من وعن قبول کیا جاتا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسجد کے منبر کو حکومت کے تخت کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ وہیں سے ریاست کی نئی پالیسیوں کا اعلان ہوا کرتا تھا اور وہیں سے جہاد کیلئے لشکر روانہ کئے جاتے اور انہیں ہدایات دی جاتی تھیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ رسول اللہﷺ نے لوگوں کو اس بات کا پابند کر رکھا تھا کہ وہ منبر سے اٹھنے والی آواز پر توجہ دیں اور اپنے دیگر مشاغل اور عبادات کو روک دیں تاکہ منبر کی جانب سے آنے والا پیغام مکمل توجہ حاصل کر سکے، جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت ہے، رسول اللہﷺ فرماتے ہیں: اذا قلت لصاحبك یوم الجمعة انصت والامام یخطب فقد لغوت۔[7]

ترجمہ: اگر امام کے خطبہ کے دوران آپ نے اپنے ساتھی سے کہا چپ ہو جاؤ، تو آپ نے لغو کام کیا۔

یقیناً یہ اسی لئے کہا گیا تاکہ سامعین کی مکمل توجہ منبر کی جانب رہے اور خطیب کی ہدایات بغور سنیں تاکہ افہام و تفہیم کا عمل آسان ہو سکے۔ اسی وجہ سے دورانِ خطبہ دیگر عبادات اور دنیاوی مشاغل میں لگنے سے بھی روکا گیا۔ الغرض دورِ رسالت اور دورِ خلافتِ راشدہ میں منبر کا کام بہت وسیع تھا۔ انسانی معاشرہ کی اصلاح کا پیغام وہیں سے صادر ہوتا اور معاشرتی زندگی کے حوالے سے لوگوں کے تمام معاملات اسی منبر سے طے ہوتے اور ان پر یہیں سے احکامات دئے جاتے اور اس وقت کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا کہ منبر پر صرف دینی بات ہو، سیاسی، جنگی اور معاشی موضوعات پر گفتگو کیلئے مسجد سے باہر کسی جگہ کا انتخاب کیا جائے۔ بلکہ لوگوں کا مزاج یہ بن چکا تھا کہ وہ اس قسم کے تمام مسائل کے حل کیلئے منبر کی جانب ہی دیکھتے تھے کہ یہاں سے اس کا حل ضرور پیش کیا جائے گا۔

منبر و محراب کا کردار دورِ حاضر میں:

اس سلسلے میں دنیا بھر میں موجود مساجد کی حیثیت اور وہاں منبر و محراب کے استعمال کے حوالے سے رائج طریقہ کار کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اکثر ممالک میں اس کے لئے ضابطہ اخلاق موجود ہے۔ ذیل میں کچھ اہم ممالک کا اجمالی ذکر کیا جا رہا ہے جس سے ہمیں کافی رہنمائی مل سکتی ہے۔ وہ ممالک جہاں بادشاہت قائم ہے جیسے عرب ممالک (سعودیہ، قطر، کویت، دبئی، ابوظہبی اور بحرین وغیرہ) ان کے ہاں اس سلسلے میں بڑا کڑا ضابطہ اخلاق موجود ہے۔ خطیب کو جمعہ کی تقریر تحریری دی جاتی ہے اور وہ اسی تقریر کو پڑھنے کا پابند ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی دینی موضوع پر اصلاحی تقریر ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ بادشاہ وقت کیلئے دعائیں ہوتی ہیں۔ خطیب اسی موضوع کے حوالے سے دین کی روشنی میں کوئی مثبت اضافہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منبر سے کسی بھی قسم کی سیاسی گفتگو اور حکومت کی پالیسیوں پر تنقید نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ عرب ممالک میں مساجد حکومت کی تحویل میں ہیں، ان کا مکمل نظم حکومت کے کنٹرول میں ہے۔ وہاں کا امام و خطیب سرکاری ملازم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے منبر سے مخصوص موضوعات پر ہی بات ہوتی ہے اور حکومت کے ظالمانہ فیصلوں پر بھی تنقید قانوناً جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ ایسے سخت قوانین کی وجہ سے اب وہاں کے منبروں سے تحریکی اور انقلابی کاموں کی امیدیں دم توڑ چکی ہیں۔

ملائیشیا، انڈونیشیا جیسے ممالک اور غیر اسلامی ریاستیں جیسے امریکا، برطانیہ اور کنیڈا وغیرہ میں بھی منبر و محراب کے حوالے سے ضابطہ

اخلاق موجود ہے۔ خطیب کی تقریر پر ریاست کی کڑی نظر رہتی ہے لیکن ان ممالک میں بلادِ عرب جیسی سختی نہیں ہے، خطیب کو تقریر تحریری نہیں دی جاتی، خطباء اپنی مرضی سے کوئی بھی اصلاحی موضوع منتخب کر لیتے ہیں۔ ریاست کی طرف سے بس اتنی پابندی ہے کہ خطیب کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا جس سے فساد ابھرے اور لوگوں میں انتشار پیدا ہو اور بہت اچھی بات یہ ہے کہ اگر ان مغربی ممالک میں کوئی قانون خلافِ شرع بنتا ہے تو خطباء اس پر شائستہ لب ولہجہ میں تنقید بھی کرتے ہیں اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہے بلکہ ان کی مثبت تنقید کو سنا بھی جاتا ہے۔

پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش جیسے ممالک میں منبر و محراب کافی آزاد ہیں اس حوالے سے کوئی ضابطہ اخلاق موجود نہیں ہے۔ خطباء اپنی مرضی سے بات کرتے ہیں۔ جب چاہیں اور جیسے چاہیں حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں اور دین کی تشریحات پیش کرتے ہیں۔ یہاں ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں کی اپنی مساجد ہیں، ان کا امام وخطیب دین کا کم لیکن اپنے مکتب فکر کا زیادہ وفادار دیکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اب مسجد معاشرتی ادارہ نہیں بلکہ نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کی ایک مخصوص جگہ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اگر بعض مساجد کو مسلکی مرکز کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ایک سنگینی کیسی کیفیت ہے اور بروقت اس کا سدِباب نہ کرنے کی وجہ سے یہ آزادی اب فرقہ واریت اور مسلکی شدت پسندی کو جنم دے چکی ہے۔ خاص طور پر ملک پاکستان اس صورت حال سے بہت زیادہ متاثر ہے اور حکومت کی طرف سے کوئی ضابطہ اخلاق موجود نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس پر کوئی عمل ہوتا نظر نہیں آتا۔ ایک طویل عرصہ بعد یہاں لاؤڈ اسپیکر کا آرڈیننس لایا گیا جس میں لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال جرم قرار دیا گیا ہے، اس پر صوبہ پنجاب میں کچھ جگہ بہت سختی سے عمل ہو رہا ہے لیکن باقی صوبوں میں اب تک اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اب کچھ عرصہ سے مختلف حکومتوں میں خطباء کو تحریری تقریریں لکھنے کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ کیا اس پر عمل ہو سکے گا؟ اس پر آگے چل کر بات کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں منبر و محراب کے اسی غلط استعمال کی وجہ سے بعض اوقات حکومت کیلئے اور کبھی عوام الناس کیلئے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ جس کی تازہ مثال حال ہی کا ترمیمی بل ہے جس میں ختم نبوت والے حصہ کو حلف نامہ کی جگہ اقرار نامہ میں تبدیل کیا گیا تو مساجد کے منبر و محراب سے اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ اسی طرح ماضی میں حقوقِ نسواں بل جیسے بلوں پر بھی مساجد کے منبر و محراب سے آزادانہ تنقید کی گئی، جس سے حکومت دباؤ میں آئی اور آخر کار اس قسم کی ترامیم واپس لی گئیں۔ عوام الناس کیلئے اس طرح کے مسائل بنے کہ مساجد کے منبر و محراب سے اپنے اپنے مسلکی عقائد و نظریات کو سامنے رکھ کر دین کی تشریحات کی جانے لگیں، گویا لوگوں کو دینی مسائل میں الجھا دیا گیا۔ دین کی جگہ مسلک کی باتیں زیادہ ہونے لگیں۔ اب فکر کی جگہ شخصیات پر تنقید ہوتی ہے اور یہ یہاں کی کئی مساجد کی صورتِ حال ہے۔ ظاہر ہے یہ سارے وہ تکلیف دہ عوامل ہیں جس کی وجہ سے لوگ معاشرتی زندگی میں مسجد اور اس کے منبر و محراب سے شاکی اور نالاں ہیں۔ یہ وہ تمام کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر مساجد کے نظم اور کنٹرول کے حوالے مختلف باتیں کی جاتی ہیں اور نچلی سطح پر یہ بات بھی زیرِ بحث آتی ہے کہ مولوی کو مسجد کا امام وخطیب نہیں ہونا چاہیے ذیل میں ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

کیا مساجد ریاست کے نظم میں ہونی چاہییں؟

ہمارے ہاں بنیادی طور پر دو مسائل ہیں: حکومت کی غیر شرعی پالیسیاں اور مسلکی شدت پسندی۔ اگر حکومت ملک میں موجود تمام مساجد کو اپنے نظم اور کنٹرول میں لیتی ہے تو اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ مسلکی انتشار اور شدت پسندی کافی حد تک ختم ہو جائے گی اور منبر و محراب کو

اِن مذموم مقاصد کیلئے استعمال نہیں کیا جاسکے گا کیونکہ مسجد سرکار کے کنٹرول میں ہوگی اور منبر پر موجود خطیب اسی سرکار کا ملازم ہوگا جو اس کے بنائے گئے ضابطہ اخلاق کا مکمل پابند ہوگا۔ البتہ اس نظم سے نقصان یہ ہوگا کہ حکومت کو اپنی ظالمانہ پالیسیوں پر مکمل آزادی مل جائے گی، کیونکہ منبر و محراب کی طرف سے تنقید کا خوف ختم ہوجائے گا۔ لیکن میرے خیال میں یہاں کی مساجد کا کنٹرول حاصل کرنا حکومت کیلئے اتنا آسان نہیں ہوگا بے شمار مساجد ہیں، عملے کی تنخواہیں، مراعات اور دیگر اخراجات برداشت کرنا کیا یہ سب حکومت کیلئے آسان ہوگا؟ شاید یہ اتنا آسان عمل نہیں ہے۔ بیرون ممالک میں اگر مساجد حکومت کے کنٹرول میں ہیں تو اسکی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں یا پھر ان کے ہاں اس سلسلے میں ابتداء ہی سے کڑا ضابطہ اخلاق موجود ہے۔ ایک فطری امر ہے کہ ریاست کو منبر و محراب کی آزادی برداشت نہیں ہوتی، اسی لئے ہر ریاست کی یہ خواہش رہتی ہے کہ مساجد پر اس کا کنٹرول رہے۔ ہمارے ہاں جنرل ایوب خان مرحوم کے دورِ حکومت میں اسی وجہ سے محکمہ اوقاف کو وجود بخشا گیا تھا اور کئی بڑی مساجد اس کی تحویل میں دے دی گئیں جو اب تک ان کے کنٹرول میں ہیں۔ اُس وقت خطباء کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ اپنی تقاریر میں حکومت کی پالیسیاں بیان کریں اور اچھے الفاظ میں ان کی تشہیر کریں۔ کچھ خطباء نے اس سے اتفاق کیا تو بہت سوں نے اس سے اختلاف بھی کیا۔ اور یوں محکمہ اوقاف کے ذریعہ مساجد پر کنٹرول کی یہ کوشش بھی ناکام ہی رہی۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا مسجد کا منبر و محراب مولوی کے حوالے کرنا چاہیے؟

سوچنے کی بات ہے کہ مولوی کو اس منبر پر بٹھایا کس نے ہے؟ یہ منبر مولوی کا نہیں، ریاست کے سربراہ کا تھا۔ ریاست کے سربراہ نے یہ منبر کیوں چھوڑا؟ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ قرونِ اولیٰ میں خلیفہ وقت کے ہاتھ پر بیعت مسجد میں ہوتی اور اس کا پہلا خطاب مسجد کے منبر سے ہوا کرتا تھا جس میں وہ اپنی ریاست کی پالیسیوں کا اعلان کرتا۔ اس کے علاوہ جب بھی پالیسیاں تبدیل ہوتیں یا کوئی اہم فیصلہ ہوتا تو اس کا اعلان بھی مسجد کے منبر سے ہی ہوا کرتا تھا۔ دورِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے ادوار میں مختلف جگہوں پر مقرر کئے گئے گورنروں کی ذمہ داریوں میں مسجد کی امامت کی ذمہ داری بھی شامل ہوا کرتی تھی۔ عباسی دور تک تسلسل کے ساتھ یہ طریقہ کار رائج رہا اور خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر اور حضرت علی نے تو اسی ذمہ داری کی ادائیگی کے دوران زخم کھائے اور جام شہادت بھی نوش فرمایا۔ حضرت عمر کو فجر کی نماز کے دوران ابولولو فیروز نے مسجد نبوی میں خنجر مار کر زخمی کیا اور حضرت علی کو کوفہ کی جامع مسجد میں نماز فجر کے دوران عبد الرحمن خارجی نے خنجر مار کر زخمی کر دیا تھا۔ اور اسی سبب یہ دونوں حضرات شہادت پا گئے۔ تو یہی منبر ہوتا جس پر ریاست کا سربراہ لوگوں سے مخاطب ہوتا۔ پھر بعد میں جب یہ سربراہان اپنی ظالمانہ پالیسیوں کی وجہ سے رعایا کا سامنا نہ کرسکے تو یہ آہستہ آہستہ اس منصب سے الگ ہوگئے اور اس ذمہ داری کو چھوڑ گئے۔ اور اس طرح یہ منصب ریاست کے سربراہان کی نااہلی اور غفلت کی وجہ سے مولوی کے پاس آگیا۔ آج بھی اگر ریاست اپنا یہ منبر واپس لے کر اس ذمہ داری کو دوبارہ قبول کرلے تو اس سے دو بڑے فائدے حاصل ہوسکتے ہیں۔

1: حکمران عوام کی عدالت میں آجائیں گے اور لوگ بر سر منبر اپنے حکمرانوں سے جواب طلبی کرسکیں گے اور ایسا قرونِ اولیٰ میں ہوتا بھی رہا ہے۔ جیسے حضرت عمر کے لباس پر بر سرِ منبر اعتراض ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں:

جاء ت عمر بن الخطاب برود من اليمن ففرقها بين المسلمين فخرج في نصيب كل رجل برد واحد و نصيب عمر كنصيب وحد منهم۔ قيل: واعتلى عمر المنبر و عليه البرد و قد فصله قميصا، فندب الناس للجهاد فقال له رجل: لاسمعا و لاطاعة۔ فقال

عمر: ولم ذٰلك؟ قال الرجل لانك استاثرت علينا، لقد خرج فى نصيبك من الابراد اليمنية برد واحد، و هو لايكفيك ثوبا، فكيف فصلته قميصا وانت رجل طويل؟ فالتفت عمر الى ابنه قائلا: اجبه يا عبدالله۔ فقال عبدالله: لقد ناولته من بردى فاتم قميصه منه۔ قال الرجل: اما الآن فالسمع والطاعة۔[8]

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب کے پاس یمن سے چادریں آئیں جو آپ نے مسلمانوں کے درمیان تقسیم فرمادیں۔ ہر شخص کے حصہ میں ایک ایک چادر آئی اور حضرت عمر کا حصہ بھی ایک مسلمان کے برابر ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر منبر پر چڑھے تو آپ نے اس چادر کا کرتا پہن رکھا تھا چنانچہ آپ نے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی۔ ایک شخص نے کہا: ہم آپ کی بات سن سکتے ہیں اور نہ ہی مان سکتے ہیں۔ حضرت عمر نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا: آپ نے خود کو ہم پر ترجیح دی ہے، یمنی چادروں میں سے آپ کے حصہ میں ایک چادر آئی جو آپ کیلئے ناکافی تھی، آپ نے اس کا کرتا کیسے بنالیا جبکہ آپ کا قد بھی طویل ہے؟ حضرت عمر اپنے صاحبزادے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے عبد اللہ اس کو جواب دو۔ عبد اللہ نے کہا: میں نے اپنے حصہ کی چادر اپنے والد کو دی تو یہ کرتا پورا ہوا ہے۔ تو اس شخص نے کہا: اب آپ ارشاد فرمائیں، ہم آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔

اور پھر اموی دورِ خلافت میں حضرت امیر معاویہ منبر پر تھے کہ جلیل القدر تابعی حضرت ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ نے ان پر اعتراض کیا اور کافی سخت الفاظ استعمال کئے۔ علامہ ابن عساکر رحمہ اللہ تاریخ مدینہ دمشق میں اس واقعہ کو یوں تحریر فرماتے ہیں:

أنه خطب الناس و قد حبس العطاء شهرين او ثلاثة۔ فقال له ابو مسلم: يا معاوية ان هذا المال ليس بمالك و لا مال ابيك ولامال امك. فاشار معاوية الى الناس ان امكثوا، و نزل فاغتسل ثم رجع، فقال: ايها الناس، ان ابامسلم ذكر ان هذاالمال ليس بمالى ولامال ابى ولامال امى، وصدق ابومسلم، انى سمعت رسول اللهﷺيقول: الغضب من الشيطان والشيطان من النار و الماء يطفىء النار، فاذا غضب احدكم فليغسل. اغدوا على عطائكم على بركة الله عزوجل۔[9]

ترجمہ: حضرت معاویہ لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے، اور آپ نے لوگوں کا دو یا تین ماہ سے وظیفہ روک رکھا تھا۔ جس پر حضرت ابو مسلم خولانیؒ نے ان سے کہا: اے معاویہ یہ مال تمہارا ہے، نہ تمہارے باپ کا اور نہ ہی تمہاری ماں کا ہے۔ حضرت امیر معاویہ نے لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی جگہوں پر رہیں۔ اور منبر سے اترے، غسل کیا اور پھر واپس آئے اور فرمایا: ابو مسلم نے کہا کہ یہ مال میرا ہے، نہ میرے باپ کا اور نہ ہی میری ماں کا، اور ابو مسلم نے سچ کہا ہے۔ بے شک میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا، آپ فرمارہے تھے "غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے ہے اور پانی آگ کو بجھاتا ہے، پس تم میں سے جسے غصہ آئے اسے چاہیے کہ غسل کرلے" اپنے وظائف لے جاؤ، اللہ آپ کو برکت عطا فرمادے۔

اور یہ سب اسلام کا رائج کردہ وہ خوب صورت طریقہ کار ہے جس میں معاشرتی زندگی کا حسن ہے کہ حاکم اپنی رعایا کی گرفت سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس نے ہفتہ میں کم از کم ایک دن اپنی رعایا کا سامنا ضرور کرنا ہے۔ اور لوگوں کو اپنی نئ پالیسیوں سے آگاہ کرنا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اگر رعایا میں سے کسی کو اس پر اعتراض ہو تو وہ وہیں حاکم وقت سے اس کا جواب بھی طلب کرسکتا ہے۔ اور حاکم پر لازم ہے کہ وہ اس بھرے مجمع میں سائل کے سوال کا تسلی بخش جواب دیکر لوگوں کو مطمئن کرے ورنہ خود کو اس منصب کیلئے نااہل سمجھے۔ اور یہ قرونِ اولیٰ کے

ذمہ داران کی دیانتداری تھی کہ وہ اپنی رعایا کا سامنا کرنے سے کبھی نہ گھبرائے اور ہمیشہ خود کو احتساب کیلئے لوگوں کے سامنے پیش کر کے ہر معقول سوال کا جواب دیا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد جب حضرت ابو بکر صدیق کو لوگوں کا پہلا خلیفہ چنا گیا تو آپ مسجد نبوی تشریف لائے اور منبر رسول پر کھڑے ہو کر ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں آپ نے لوگوں کو ریاست کی غلط پالیسیوں پر تنقید اور نظام کو درست کرنے کا مکمل حق دیتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

ایھا الناس: فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان زغت فقومونی۔[10]

ترجمہ: اے لوگو! میں تمہارے اوپر متولی بنا دیا گیا ہوں جبکہ مجھے تم سے بہتر ہونے کا دعوی نہیں ہے۔ پس اگر میں صحیح راستہ پر چلوں تو میری مدد کرنا اور اگر میں نے کجی اختیار کی تو تم مجھے سیدھا کر دینا۔

ایک موقع پر جب کسی شخص نے حضرت عمر سے کہا "اتق اللہ یا عمر" کہ اے عمر اللہ سے ڈر۔ تو حاضرین میں سے کسی نے جب اسے روکنا چاہا تو حضرت عمر نے فرمایا: "نہیں، کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں گے تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم نہ مانیں تو ہم "[11]

یہ شریعت اسلامیہ کا قائم کردہ وہ حسین دستور ہے جس میں رعایا اپنے خلیفہ اور حاکم وقت کا احتساب نقد کرتی ہے۔ اسے کسی قاضی کی عدالت میں گھسیٹنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اگلے انتخابات کی۔ جمہوری طرزِ حکومت میں ریاست کی ہر طرح کی پالیسیوں اور جرائم کو عوام اگلے انتخابات تک برداشت کرتے ہیں۔ نئے انتخابات کے موقع پر ہر جماعت اپنے جلسوں میں کہتی ہے کہ ہمارا احتساب عوام کریں گے۔ کیا یہ احتساب کے عمل کو شرمندہ کرنے والا طرزِ عمل نہیں؟ کیا قرونِ اولیٰ میں حکام کا احتساب یوں سالوں بعد ہوا کرتا تھا؟ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ادارے انتہائی کمزور ہیں اور مزید کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ریاست کے یہ ذمہ داران خود کو ہر جمعہ اس طرح عوام کی عدالت میں پیش کریں، پھر دیکھیں ریاست کے نظام میں درستگی آتی ہے یا نہیں۔

2: مولوی سے آپ کی تمام شکایات دور ہو جائیں گی۔ منبر و محراب کا تکفیری اور تفریقی کاموں کے لئے استعمال بند ہو جائے گا۔ مسلک کی خدمت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اور اس طرح اگر مسلکی شدت پسندی بالکل ختم نہیں ہو گی تو کم از کم کافی حد تک کمزور ضرور ہو جائے گی۔ الغرض مسجد کا منبر ریاست کی جگہ ہے۔ اس پر ریاست کا امیر یا پھر اس کا نائب ہوا کرتا تھا، اسے دوبارہ ریاست کے پاس جانا چاہیے۔ کیا ریاست مسجد کے موجودہ خطیب کو اپنا نمائندہ تسلیم کرتی ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ عباسی دورِ خلافت کے بعد سے ریاست نے اس اہم منصب کو یوں چھوڑا کہ اس پر دوبارہ خود بیٹھا، نہ اپنا نائب بٹھایا اور نہ ہی اس منصب کی خبر لی۔ چنانچہ مذہبی، سماجی اور سیاسی طور پر مسائل بڑھتے چلے گئے اور ہنوز بڑھتے جا رہے ہیں۔

منبر و محراب کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ چند تجاویز!

1: منبر و محراب سے تعمیری بات ہو، تکفیری اور تفریقی گفتگو پر مکمل پابندی ہو۔ اگر تھوڑا سا اس بات پر غور کر لیں کہ مسجد کی تعمیر کے مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ تو آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اس کی تعمیر کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ اس علاقہ کے مسلمانوں کو مسجد کے ذریعہ متحد رکھا جائے اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے باخبر رکھا جائے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مسجد اجتماعیت کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اسی طرز پر اسے

آج بھی اجتماعیت کا مرکز ہونا چاہیے۔ یہاں سے اٹھنے والی بات تعمیری ہو، نہ کہ تکفیری اور تفریقی، یہاں کی گفتگو اتحاد کا سبب ہو، نہ کہ اختلاف کا۔ منبر و محراب کا غلط استعمال مسلمانوں میں انتشار کی راہ ہموار کرے گا جس کے بعد یہ مقدس جگہ کبھی اجتماعیت کا مرکز نہیں بن سکے گی۔ قرآن کریم میں مختلف مساجد کا ذکر ہے، منجملہ ان مساجد میں ایک مسجدِ ضرار بھی ہے۔ اس مسجد کے حوالے سے قرآن کریم کی آیت کا جائزہ لینے کے بعد یہ موضوع کافی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

والذین اتخذوا مسجدا ضرارا و کفرا و تفریقا بین المؤمنین و ارصادا لمن حارب اللہ و رسولہ من قبل۔[12]

ترجمہ: اور وہ لوگ جنہوں نے مسجد اس مقصد کے لئے بنائی کہ (اہل ایمان) کو تکلیف پہنچائیں، کفریہ گفتگو کریں، ایمان والوں کے درمیان پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کو ایک جگہ فراہم کریں جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ میں ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مذموم مقاصد کی بنیاد پر مسجد کی تعمیر کو یکسر مسترد فرماتے ہوئے مسجدِ ضرار کو گرانے کا حکم دیا، لیکن غور طلب امر ہے کہ کس بنیاد پر؟ اللہ پاک نے اس کی وجوہات بیان فرمائی ہیں جن میں سے یہاں دو وجوہات قابلِ ذکر ہیں، "کفرا و تفریقا بین المؤمنین" کہ یہ مسجد تکفیری اور تفریقی مقاصد کیلئے بنائی گئی تھی۔ جبکہ مسجد اللہ کا گھر ہے جس کی تعمیر خالص تقوی کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اس کا مقصد تکفیر و تفریق کا خاتمہ ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا مسجد کے منبر و محراب کا ان شرمناک مقاصد کیلئے استعمال قابل گرفت جرم تصور کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں مختلف مسالک کا وجود کسی آزمائش سے کم نہیں ہے، یہاں مسالک کی بنیاد پر مساجد تعمیر ہوتی ہیں اور پھر اپنی مسجد کے منبر و محراب کو مخالف مسلک والوں کے خلاف استعمال کرنا ایک عام سی بات ہے۔ اس بات سے بھی صَرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سی مساجد کا معاشرے میں انتہائی مثبت کردار بھی ہے، وہاں کے منبر و محراب کو اس طرح کے مذموم مقاصد کیلئے ہرگز استعمال نہیں کیا جاتا لیکن ایسی مساجد کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں جہاں سے مثبت کم اور منفی زیادہ یا پھر مثبت اور منفی ملا جلا کردار پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی مساجد کے منبر و محراب کو ایک دوسرے پر کفر اور گستاخی رسول کے فتووں کیلئے بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے جس کا ہم اب تک نقصان ہی دیکھتے آرہے ہیں۔ منبر پر موجود فرد کو اس مقام کی نزاکتوں کا مکمل اندازہ ہونا چاہیے، کیونکہ یہ جگہ انتہائی حساس ہے۔ مسجد کا امام و خطیب قوم کے سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی جانب سے نفرت نہیں محبت کا پیغام جانا چاہیے اور اس کا کام تخریبی نہیں تعمیری ہونا چاہیے۔

2: منبر و محراب کی خدمات میں وسعت اور مسجد کی موجودہ حیثیت کو تبدیل کرکے اس کی افادیت عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بات سمجھنی ہوگی کہ مسجد صِرف عبادت کا مرکز نہیں ہے۔ دورِ رسالت میں مسجد نبوی کی حیثیت اور اس کی خدمات کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت انسان کی معاشرتی زندگی میں خدا کے اس گھر کا کردار کیا تھا۔ قرونِ اولیٰ میں مسجد کو فقط عبادت گاہ نہیں بلکہ ایک جامع ادارہ تصور کیا جاتا تھا، جہاں عدالت بھی لگتی تھی، مختلف وفود سے ملاقاتیں بھی ہوا کرتی تھیں اور اہم امور پر تبادلہ خیال بھی ہوتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بعد کے ادوار میں مسجد کے کردار کو محدود کیا جانے لگا۔ ہمیں از سرِ نو اس بات جائزہ لینا چاہیے کہ مسجد اور اس کے منبر و محراب کی جانب لوگوں کی توجہ کیسے بڑھائی جاسکتی ہے اور یہاں کی خدمات میں کیسے وسعت پیدا کی جاسکتی ہے۔ ہمیں اپنے نوجوانوں پر خاص طور پر محنت کی ضرورت ہے۔

گرمیوں، سردیوں اور امتحانات کی چھٹیوں سے فائدہ اٹھاکر کیوں نہ منبر و محراب سے ان نوجوانوں کے لئے کسی خاص کورس کا اہتمام کرلیا جائے،اور ان کو دینی،سیاسی اور سماجی مسائل سے آگاہ کرکے اس کا حل پیش کیا جائے۔

دورِ حاضر میں مغربی ممالک کی بعض مساجد کا ماحول ہمارے ہاں سے کافی مختلف ہے۔ان مساجد سے متصل لائبریریاں موجود ہیں اور ساتھ ساتھ اِن ڈور اسپورٹس کی بھی سہولت موجود ہے جس کی وجہ سے نوجوانوں کی رغبت ایسی مساجد کی طرف زیادہ ہے،یہ نوجوان وہاں نماز کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ان سہولتوں سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔کچھ اس قسم کی سرگرمیاں ہمارے ہاں بھی شروع کی جائیں تو شاید ہماری یہ کاوش نوجوانوں کا مساجد کی طرف التفات بڑھادے۔ایسی سرگرمیوں کا انتظام ہو جو خلاف شرع نہ ہوں اور ان سے برابر میں موجود مسجد کا تقدس بھی پامال نہ ہو۔اسلام صحت مند تفریح اور کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

3: مسلکی اختلافی مسائل کی جگہ دینی مشترکات پر بات کی جائے۔ہمیں وطنِ عزیز میں مختلف مسالک کا سامنا ہے جس کی وجہ سے کچھ لوگوں میں اس حوالے سے کافی شدت بھی دیکھی جاتی ہے۔ یہاں مسالک کی بنیاد پر مساجد اور دیگر ادارے تعمیر ہوتے ہیں۔ کچھ جگہوں پر مختلف مسالک کی مسجدیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بنی ہوئی ہیں۔ایک جگہ کسی خاص مکتب فکر کی مسجد تعمیر ہو جائے تو دوسرے مکتب فکر والے اس کے مدمقابل اپنے مسلک کی مسجد کی تعمیر کرنے کی کوششیں کرتے ہیں،اور یہ یہاں کی ایک عام سی سماجی برائی ہے جو دین کے نام پر ہورہی ہے۔پھر ایسی مساجد کے منبر و محراب سے اٹھنے والی آواز بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔یہاں کے خطباء ایک مخصوص فکر کو لیکر مسجد کے منبر پر آکر خطاب کرتے ہیں جس میں دین کے دیگر اہم اور ضروری موضوعات کو نظر انداز کرکے اپنے ان مخصوص اختلافی عقائد و نظریات پر گفتگو کرتے ہیں جو عوام میں افتراق کا سبب بنتے ہیں۔اس ماحول سے دو بڑے نقصان دیکھے گئے ہیں،دین کے بعض امور کو متنازعہ بنادیا گیا اور دوسرا یہ کہ بہت سے لوگ اس طرح کی باتوں سے تنگ آکر مسجد کے ماحول سے خود کو الگ کرگئے۔ لہٰذا منبر سے اٹھنے والی آواز متنازعہ ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ایسے مسلکی اختلافی مسائل چند ہی ہیں،باقی پورا دین سب کے درمیان مشترک ہے۔اگر ان اختلافی مسائل کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے مشترکات پر بات کرلی جائے تو سامعین کو دین سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملے گا اور مسلکی شدت پسندی میں کافی حد تک کمی واقع ہوگی۔

4: منبر و محراب سے دعوتِ دین کا کام انبیاء کے اسلوب پر ہونا چاہیے۔ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ اس امت کے علماء انبیاء علیہم السلام کے علمی وارث ہیں تو پھر اس بات سے اتفاق کرنا ضروری ہوگا اِن وارثانِ انبیاء کی سوچ، فکر اور ان کا اندازِ دعوت انبیاء علیہم السلام کے طرز و اسلوب پر ہو۔ قرآن حکیم کے اوراق بتاتے ہیں کہ یہ پیغمبرانِ خدا کتنی محبت کے ساتھ اپنی قوم کو دین کی دعوت دیتے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا پیغام پہنچاتے۔اِن نبوت کے میناروں نے اپنی دعوت کے دوران جب بھی اپنی قوم کو پکارا تو "یاایھاالناس"(اے لوگو)"یاایھا الانسان" (اے لوگو)اور"یقوم"(اے میری قوم)جیسے خوب صورت الفاظ سے پکارا۔البتہ تبلیغِ دین کرتے کرتے جب قوم کے عناد اور ضد کو محسوس کیا گیا اور پھر ان سے بیزاری اور برات کے اعلان کی نوبت پیش آئی تو واضح الفاظ میں برات کا اظہار ہوا اور بڑی صراحت کے ساتھ کافر بھی کہہ دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ میں دیکھا جاسکتا ہے کہ آپ نے کتنی فکر کیساتھ سردارانِ قریش کو دعوت دی اور اس مشن کو مستقل جاری

رکھا لیکن جب ہجرت کے موقع پر برات کا اظہار کرنا پڑا تو قرآنِ پاک کی درج ذیل سورت اِن الفاظ کیساتھ نازل ہوئی: قل یایھا الکافرون، لااعبد ماتعبدون، ولاانتم عٰبدون مااعبد، ولا انا عابد ماعبدتم، ولاانتم عٰبدون مااعبد، لکم دینکم ولی دین۔[13]

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اے کافرو! میں اُن چیزوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم کرتے ہو، اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں کرتا ہوں، اور نہ ہی میں اُس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں، تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے۔

اس کے علاوہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اندازِ دعوت اور آپ کا امتیازی اسلوب کسی سے مخفی نہیں ہے۔ کبھی شاہی دربار میں نمرود کے سامنے، کبھی گھر میں والد اور کبھی سرِبازار قوم کے سامنے ہیں اور ان کی دھمکیوں کا جواب بھی انتہائی شائستہ انداز سے دیتے جارہے ہیں۔ لیکن جب ان کے کفر سے اعلانِ برات کرنا پڑا تو پھر کھل کر اس کا اظہار بھی فرمادیا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ، اذ قالوا لقومھم انا برءٰؤا منکم ومما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم و بدا بیننا وبینکم العداوۃ و البغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ۔[14]

اپنی قوم کو سمجھانے کیلئے اسی طرح کا اندازِ دعوت اور اسلوب اختیار کرنا ضروری ہے اور اسی کے اچھے اثرات پڑتے ہیں۔ اور پھر ساتھ خطیب کا انداز پُر اثر ہو تاکہ زبان سے نکلی ہر بات سامعین کے دلوں پر پڑے جیسا کہ حضرت جابر، نبی کریم ﷺ کا انداز نقل کرتے ہیں:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب احمرت عیناہ، وعلا صوتہ، واشتد غضبہ حتی کأنہ منذر جیش، ویقول: صبحکم ومساکم، ویقول: بعثت انا والساعۃ کھاتین، ویقرن بین اصبعیہ السبابۃ والوسطی۔[15]

ترجمہ۔ رسول اللہ ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور لہجہ میں شدت پیدا ہو جاتی، گویا آپ کسی لشکر سے ڈرا رہے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ وہ لشکر صبح و شام میں کسی وقت ٹوٹ پڑنے والا ہے، اور فرماتے: میرے اور قیامت کے درمیان بس شہادت اور بیچ والی انگلی جتنا فرق ہے۔

یہ انبیاء اور رُسل طبقاتی جنگ نہیں لڑا کرتے تھے اور نہ ہی یہ اپنی قوم کے حوالے سے کسی بھی طرح کے سیاسی اور معاشی تعصبات کا شکار تھے۔ یہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھنے والے لوگ تھے اور پیغمبری کے اس منصب کو اپنے لئے چیلنج سمجھتے تھے۔ چنانچہ پورے خلوص کے ساتھ اپنے لوگوں سے مخاطب ہوئے اور عنداللہ کامیاب بھی ہوئے۔ اسی اسوہ حسنہ کی ضرورت ہے۔ منبر پر موجود خطیب میں اس طرز و اسلوب کی جھلک نظر آنی چاہئے، ان عظیم پیغمبروں کا اسوہ اپنا کر لوگوں سے مخاطب ہونا چاہیے تاکہ لوگوں پر اس کا اچھا اثر ظاہر ہو۔

5: سماجی عصری مسائل پر بات ہونی چاہیے۔ ہمارے خطباء کی تقاریر میں عام طور پر فضائل کا پہلو غالب رہتا ہے۔ انبیاء، صحابہ اور دیگر اعمالِ صالحہ کی فضیلتوں کا ذکر یقیناً باعث رحمت ہے لیکن ساتھ ساتھ عصری سماجی دینی مسائل پر بھی گفتگو وقت کی اہم ضرورت ہے، آپس کے حقوق، وراثت، جہیز، ایذاءِ مسلم اور اہم تجارتی مسائل کو موضوع بنا کر لوگوں کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ ہمارے نئے خطباء اپنے بیانات کی تیاری کیلئے عموماً مروجہ کتبِ خطبات کا مطالعہ کرتے ہیں جو ایک خاص ماحول اور وقت میں لکھی یا کی گئی تقاریر ہیں اور ان پر ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، جسکی وجہ سے ان تقاریر میں آج کے بہت سے اہم مسائل موجود نہیں ہیں۔ خطاب اپنے وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ لہٰذا

موجودہ خطیب کو اپنے دور کی نزاکتوں اور مسائل کو سامنے رکھ کر لوگوں کی رہنمائی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ استفادے کے مواقع فراہم ہو سکیں۔

6: تنقید شخصیات نہیں بلکہ ان کے باطل افکار پر ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں انبیاء علیہم السلام کا طرزِ عمل جاننا ضروری ہے۔ دورِ رسالت اور دورِ خلافت راشدہ سے بھی رہنمائی ہوتی ہے کہ یہ حضرات شخصیات پر تنقید نہیں فرماتے تھے، مکمل توجہ ان شخصیات کے گمراہ کن نظریات پر ہوا کرتی تھی اور بڑی شائستگی کے ساتھ ان کے افکار پر رد ہوا کرتا تھا، کیونکہ قرآن کریم کا اپنا بھی یہی انداز ہے۔ منبر سے کسی شخصیت کا نام لے کر اس پر تنقید کرنا بسا اوقات خطیب کو متنازعہ بنا دیتا ہے جو کہ خسارے والی بات ہے کہ اس کے بعد خطیب اور سامعین کے درمیان فاصلے بڑھ جایا کرتے ہیں۔ لہٰذا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ تنقید میں انداز و بیاں شائستہ ہو، گفتگو مدلل ہو اور تنقید شخصیات کی جگہ ان کے باطل افکار پر ہو۔

7: اہل افراد کا انتخاب ہونا چاہیے۔ اس منصب کی غیر معمولی عظمت ہے لہٰذا فقط عالم دین ہونا اس منصب کے اہل ہونے کیلئے کافی نہیں ہو گا۔ اس منبر کی بڑی ذمہ داریاں ہیں جس کیلئے عالم دین ہونے کے ساتھ بہت سی مزید خوبیاں بھی درکار ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ کے عمل سے رہنمائی ملتی ہے کہ جب آپ ﷺ غزوات کیلئے تشریف لے جانے کا ارادہ فرماتے تو اس دوران اپنی عدم موجودگی میں کس طرح کی شخصیات کا اپنی نیابت کیلئے انتخاب فرماتے۔ اِن نائبین میں حضرت سعد بن معاذ، حضرت زید بن حارثہ اور حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم جیسے جلیل القدر صحابہ کرام کے نام ملتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کا اپنے مرضِ وفات میں امامت کیلئے سیدنا ابو بکر صدیق جیسے انتہائی دانا اور صاحبِ علم صحابی کا انتخاب واضح رہنمائی کرتا ہے کہ اس منبر پر لوگوں میں سب سے زیادہ صاحبِ علم اور معاملہ فہم انتہائی سمجھدار فرد کا انتخاب ہونا ہی ضروری ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ معتمد اور مشیر خاص تھے، بڑی باریکی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے والے شخص تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنے تمام صحابہ کرام میں ایسے صحابی کو امامت کیلئے منتخب کرنا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ منصب انتہائی حساس ہے لہٰذا اس کیلئے کسی غیر معمولی فرد کا انتخاب ہی ضروری ہے۔ اور یقیناً ایسا ہی شخص اس منصب کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ہم اس حوالے سے بہت کمزور واقع ہوئے ہیں۔ مساجد کی انتظامیہ کے افراد عموماً اتنی سمجھ نہیں رکھتے ہیں کہ وہ اس منصب کے لئے کسی اچھے صاحبِ علم کا انتخاب کر سکیں۔ چنانچہ ایسے افراد کا انتخاب کر لیا جاتا ہے جو کم سے کم مشاہرے میں یہ ذمہ داری قبول کر لیں۔ میرے خیال میں اس ساری صورت حال میں زیادہ قصوروار مساجد کے منتظمین ہیں، نہ کہ اِن مساجد کے آئمہ اور خطباء۔

8: خطباء کے لئے کوئی تربیتی کورس ہو۔ جن اداروں سے یہ آئمہ اور خطباء نکلتے ہیں ایسے اداروں کو اس طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ایسے نئے فضلاء پر امتیازی محنت کریں، ان کو دعوت کا اسلوب سمجھائیں اور ان کی سوچ تعمیری بناتے ہوئے انہیں حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کریں اور ان پر مکمل سرپرستی رکھیں تاکہ معاشرہ دینی اور مذہبی اعتبار سے ترقی کر سکے۔

9: نمازِ جمعہ کا اہتمام صرف جامع مسجد میں ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں کچھ جگہوں پر مساجد ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، ایسی صورتِ حال میں ان تمام مساجد میں نماز جمعہ کا قیام جمعہ کی اصل روح کو متاثر کرنے کا سبب ہے۔ نماز جمعہ کی روح ہی یہی ہے کہ ایک ہی جگہ پر مسلمانوں کا بڑا اجتماع منعقد ہو، چنانچہ امام سرخسیؒ اس حوالے سے فرماتے ہیں: وتجویز اقامۃ الجمعۃ فی موضعین فی مصر واحد تقلیل الجمعۃ

و اقام الجمعة من اعلام الدین، فلا یجوز القول بما یؤدی الی تقلیلها۔[16] ایک شہر کی دو مسجدوں میں نماز جمعہ کو جائز قرار دینا قلت جماعت کا سبب ہو گا جبکہ نماز جمعہ کا قیام دین کی علامات میں سے ہے لہٰذا ایسی بات کا قائل ہونا درست نہیں ہو گا جو جمعہ میں قلت جماعت کا سبب بنے۔

گویا نماز جمعہ شعائر اسلام میں سے ہے اس کیلئے لوگوں کا عظیم اجتماع ہونا ہی اس کی اصل روح ہے۔ مختلف مساجد میں الگ الگ نمازِ جمعہ کا قیام اس کی اس اصل روح کے ہی منافی ہے۔ دورِ رسالت اور دورِ خلافت راشدہ میں یہی طریقہ کار رائج رہا کہ ایک شہر میں کئی مساجد ہوتی تھیں لیکن متعدد جگہوں پر نماز جمعہ کے قیام کو پسند نہیں کیا جاتا، جیسا کہ علامہ سرخسیؒ اس کی وضاحت فرماتے ہیں: ان فی زمن رسول الله ﷺ و الخلفاء بعده فتحت الامصار و لم یتخذ احد منهم من کل مصر اکثر من مسجد واحد لاقامة الجمعة، و لو جاز اقامتها فی موضعین جاز فی اکثر من ذٰلك فیؤدی الی القول بأن یصلی اهل کل مسجد فی مسجدهم و أحد لا یقول بذٰلك۔[17]

ترجمہ: بے شک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کے ادوار میں بہت سے شہر فتح ہوئے، جبکہ ان میں سے کسی نے بھی نمازِ جمعہ کیلئے ایک شہر میں ایک سے زیادہ مسجد نہ بنائی۔ اگر نماز جمعہ کا قیام ایک شہر میں دو جگہ جائز ہوتا تو دو سے زائد جگہوں میں بھی جائز ہو گا اور پھر نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر مسجد والے اپنی ہی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کریں گے جبکہ اسکا کوئی بھی قائل نہیں۔

معلوم ہوا کہ تاریخ اسلام کے اِن عظیم ادوار میں شہروں میں مساجد تو زیادہ بنتی تھیں لیکن ایک شہر میں نمازِ جمعہ کیلئے جامع مسجد صرف ایک ہی ہوا کرتی تھی تاکہ مسلمانوں کا اجتماع نہ ٹوٹے اور تمام اہل ایمان ایک ہی جگہ ایک ہی امام کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے بعض آئمہ مجتہدین نے بھی ایک شہر میں تعدّدِ جمعہ کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ علامہ کاسانیؒ اس جانب یوں اشارہ فرماتے ہیں: و أما اقامة الجمعة فی مصر واحد فی موضعین فقد ذکر الکرخی انه لا باس بأن یجمعوا فی موضعین أو ثلاثة عند محمد هکذا ذکر۔ وعن ابی یوسف روایتان، فی روایة قال لا یجوز الا اذا کان موضعی الاقامة نهر عظیم کدجلة أو نحوها فیصیر بمنزلة مصرین، و قیل انما تجوز علی قوله اذا کان لا جسر علی النهر، فاما اذا کان علیه جسر فلا لان له حکم مصر واحد و کان یامر بقطع الجسر یوم الجمعة حتی ینقطع الفصل۔ و فی روایة قال یجوز فی موضعین اذا کان المصر عظیما و لم یجز الثلاث، و اذا کان بینهما نهر صغیر لا یجوز۔ فان ادوها فی موضعین فالجمعة لمن سبق منها و علی الآخرین ان یعبدوا الظهر، و ان ادوها معا أو کان لا یدری کیف کان لا تجوز صلاتهم۔ و روی محمد عن ابی حنیفة انه یجوز الجمع فی موضعین أو ثلاثة أو اکثر من ذٰلك۔[18]

ترجمہ: اور ایک شہر میں دو جگہ نماز جمعہ قائم کرنے کے بارے میں امام کرخیؒ نے لکھا ہے کہ دو یا دو سے زائد جگہوں پر نماز جمعہ قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، امام محمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ البتہ اس میں امام ابو یوسفؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دو جگہ نمازِ جمعہ کو ادا کرنا جائز نہیں ہے مگر اس صورت میں کہ ان دونوں جگہوں کے درمیان دجلہ یا اس جیسی کوئی بڑی نہر ہو، ایسی صورت میں یہ دو شہر شمار ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کے ہاں تب جائز ہے جب نہر کے اوپر کوئی پُل نہ ہو، اگر پُل ہوا تو پھر یہ جائز نہ ہو گا کیونکہ اب یہ ایک ہی شہر کے حکم میں ہو گا، اور اس لئے امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جمعہ والے دن اس پُل پر آمد و رفت کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے تاکہ رابطہ ختم ہو جائے۔ اور دوسری روایت کے مطابق فرماتے ہیں کہ اگر شہر بڑا ہو تو دو جگہوں پر نمازِ جمعہ کی ادائیگی درست ہے، البتہ تیسری جگہ پر جائز نہ ہو گا۔ اور اگر دونوں جگہوں کے درمیان کوئی چھوٹا پُل ہو تو بھی جائز نہیں ہو گا۔ اگر لوگوں نے دو جگہوں پر جمعہ ادا کیا تو پہلے ادا کرنے والوں کا

جمعہ ہو گیا اور بعد والوں کو چاہئے کہ وہ ظہر ادا کریں، اور اگر دونوں نے ایک ساتھ جمعہ ادا کیا یا کسی کو نہیں معلوم کہ کس نے پہلے اور کس نے بعد میں ادا کیا ہے تو کسی کا جمعہ نہیں ہوا۔ اور امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ دو تین اور اس سے زائد جگہوں پر بھی جمعہ جائز ہے۔

امام کاسانیؒ کا یہ اقتباس کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور فراہم کرتا ہے کہ آئمہ مجتہدین نے ایک شہر میں بلاضرورت کئی مساجد میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کو مناسب نہیں سمجھا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جمعہ کی اصل روح کو برقرار رکھتے ہوئے بلاضرورت کئی جگہوں پر جمعہ کی نماز قائم نہ کی جائے۔ اور ہمارے ہاں تو شہر نہیں بلکہ علاقوں کی سطح پر کئی مساجد قائم ہیں، جن میں کئی مساجد کا رقبہ کافی کم بھی ہے لیکن ان تمام مساجد میں جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ میرے خیال میں علاقہ کی سطح پر کسی ایک بڑی مسجد کو نماز جمعہ کے لئے منتخب کر دیا جائے، نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے بامر مجبوری دو جگہوں کو بھی منتخب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہر مسجد میں نماز جمعہ کا قیام کسی بھی صورت مناسب عمل نہیں ہے۔ اس پابندی سے مختلف مساجد سے جمعہ کے بیان کے ذریعہ ہونے والی مسلکی جنگ کو روکا جاسکتا ہے جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔

10: حکومت کے اہم ذمہ داران جمعہ کے اجتماعات میں عوام سے خطاب کریں۔ شہر اور علاقہ کی سطح پر تمام مساجد وزراء، ڈی سیز، آئی جی، ڈی آئی جی، متعلقہ علاقہ کے چیئرمینوں اور کونسلروں میں تقسیم کر دی جائیں، اور یہ ذمہ داران اپنی متعلقہ مساجد میں نماز جمعہ کے موقع پر حاضر ہوں اور اپنی تقاریر میں ملکی اور صوبائی خدمات اور مسائل سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ ساتھ میں اس بات کی بھی اجازت ہونی چاہیے کہ لوگ اِن متعلقہ ذمہ داران سے ان کی ذمہ داریوں کی بابت سوالات بھی کر سکیں۔ دارالحکومت اسلام آباد کی فیصل مسجد میں ماہانہ کی بنیاد پر جمعہ کے اجتماع سے خطاب بالترتیب صدرِ پاکستان، وزیر اعظم، چیف آف آرمی اسٹاف اور کوئی وفاقی وزیر کرے۔ صوبہ کی بڑی مساجد میں گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کا خطاب ہونا چاہیے۔ اِن ذمہ داران کی ظاہری وضع قطع غیر شرعی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو ان کے پیچھے نماز پڑھنے پر اعتراض ہو گا لیکن ان کا خطاب سننے پر کسی کو اشکال نہ ہو گا۔ پھر لوگ بھی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں گے کہ اس طرز عمل سے کتنا فائدہ ہوا ہے۔ یقیناً اس طرز عمل سے دور حاضر میں خلافت راشدہ کی کچھ جھلک نظر آنا شروع ہو جائے گی اور لوگ اپنے حکام کا خود احتساب کر سکیں گے۔

خلاصہ بحث:

مسجد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا گھر ہے جو اہل اسلام کیلئے صرف عبادت ہی نہیں بلکہ اجتماعیت کا مرکز بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسجد سے بڑی مضبوط وابستگی رکھی اور لوگوں کو بھی اس سے جوڑے رکھا، چنانچہ مسجد ایک معاشرتی ادارہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

منبر و محراب مسجد ہی کا ایک اہم اور حساس مقام ہے جہاں سے لوگوں کو مذہبی، سیاسی اور سماجی رہنمائی فراہم کی جاتی تھی۔ دورِ رسالت اور خلافتِ راشدہ میں اس کی خدمات کافی وسیع تھیں۔ خلیفہ وقت کا خطاب منبر پر سے ہی ہوتا تھا، یہیں سے ریاست کی نئی پالیسیوں کے بارے میں رعایا کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جب ریاست کے ذمہ داران اس منصب سے الگ ہو گئے تو اس کی خدمات میں وسعت بھی ختم ہو کر سمٹتی چلی گئی، چنانچہ اب منبر و محراب کی ذمہ داری مذہبی رہنمائی ہی رہ گئی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں ہمارے ہاں کی کئی مساجد کی صورت حال بہت ہی ناگفتہ بہ ہے۔ یہاں کے منبر و محراب سے دین کی کم جبکہ مسلک کی بات زیادہ سننے کو ملتی ہے، منبر پر بیٹھا شخص دین کا نہیں بلکہ مسلک کا داعی سمجھا جاتا ہے۔ وہی روایتی اختلافی باتیں دہرائی جاتی ہیں جو ایک زمانہ سے چلتی آرہی ہیں، مذہبی عصری مسائل کو نظرانداز کر دیا

جاتا ہے اس سلسلے میں اکثر ممالک میں ضابطہ اخلاق موجود ہے۔ عرب ممالک میں خطباء کو باقاعدہ تحریری تقاریر دی جاتی ہیں البتہ مغربی ممالک میں خطباء کو تحریراً کچھ نہیں دیا جاتا لیکن کسی بھی قسم کی اختلافی گفتگو کی صورت میں ریاست کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں منبر و محراب کافی آزاد ہیں یہ آزادی معاشرہ میں اصلاح نہیں، بگاڑ کا سبب ہے۔ لہٰذا یہ منصب سلجھے ہوئے صاحب استعداد اہل علم کے پاس ہونا چاہیے جو حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہوں اور ایسے علماء مسلکی نہیں بلکہ اہم دینی سماجی مسائل پر گفتگو کر کے لوگوں کی رہنمائی کریں۔ ریاست کے ذمہ داران کو بھی اس منصب پر آتے رہنا چاہئے تاکہ رعایا کی سیاسی رہنمائی بھی ہو سکے اور اِن ذمہ داران و عوام کے درمیان فاصلے ختم ہو سکیں۔

حوالہ جات

[1]عسقلانی، ابن حجر، حافظ، فتح الباری، المطبعة البهية، مصر،1348ھ،ج1،ص441

[2]نعمانی، شبلی، علامہ، سیرت النبیﷺ، دارالاشاعت، کراچی،،1985ء،ج2،ص33

[3]بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، قدیمی کتب خانہ، کراچی، 1961ء،ج1،ص66

[4]مبارکپوری، صفی الرحمن، مولانا، الرحیق المختوم، المکتبۃ السلفیۃ، لاہور، 1997ء، صفحہ 255

[5]ایضاً ،ص58

[6]محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغه، ادارة الطباعة المنيرية، مصر،1352ھ،ج1،ص192

[7]صحیح بخاری، باب الانصات یوم الجمعة، ص127

[8]ہیکل، محمد حسین، الفاروق عمر، دارالمعارف، مصر،2000ء،ج2،ص194

[9]ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق، دارالفکر، بیروت، 1418ھ،ج59،ص169

[10]ابن کثیر، عماد الدین، حافظ، البدایہ والنہایہ، فصل خلافۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ، مطبعة السعادة، مصر،1351ھ،ج6،ص301

[11]ندوی، شاہ معین الدین احمد، سیر الصحابہ، لاہور، ادرہ اسلامیات،1987ء،ج1،ص134

[12]القرآن107:9

[13]سورۃ الکافرون

[14]القرآن،4:60

[15]جوزی، ابن قیم، زاد المعاد، فصل فی ہدیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خطبتہ، مؤسسة الرسالة، بیروت،1407ھ،ج1،ص186

[16]سرخسی، محمد بن احمد، شمس الائمہ، المبسوط، باب الجمعہ، ادارة القرآن و العلوم الاسلامیہ، کراچی،1987ء،ج1،ص121

[17]ایضاً

[18]کاسانی، ابوبکر، علاؤالدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، شرکة المطبوعات العلمية، مصر، 1327ھ،ج1،ص260